محمد جعفر پھلواروی

اسلام اور فطرت

(سلسلہ کے لیے دیکھیے ثقافت جولائی ۱۹۶۳ء)

قصص کی چند مثالیں

قرآن پاک نے جہاں قصص بیان فرمائے ہیں وہاں ایک مقام بھی ایسا نہ ملے گا جہاں فطرت کے خلاف کوئی بات نظر آئے۔ جس کے متعلق بھی قرآن نے کچھ بیان کیا ہے وہ اس کی عین اصلی فطرت کا آئینہ ہے۔ جہاں پیغمبر کی کوئی گفتگو نقل کرتا ہے وہاں لفظ لفظ سے پیغمبرانہ عظمت جھلکتی نظر آتی ہے۔ جہاں دنیا پرست کی زبان سے کوئی بات ادا ہوتی ہے وہاں اس کی ذہنی پستی یا غرور و تکبّر کا انداز پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک جس کے کردار کو بیان بیان کرتا ہے وہ بالکل اس کی فطری ذہنی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے:

سورۂ یوسف ایسی سورت ہے جہاں حضرت یوسفؑ کا پورا واقعہ ایک ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے اور اس ضمن میں باپ (یعقوب پیغمبر) سوتیلے بھائی، عزیز مصر اور اس کی عورت، نان پز، ساقی، وغیرہ کے گفتار و کردار کو بھی مختلف جگہ نقل کیا گیا ہے۔ لیکن ہر ایک کی ذہنی سطح اور خاص کردار اس طرح نمایاں ہیں جن میں نہ کوئی کمی سے نہ مبالغہ۔ اس کے چند مقامات کو ملاحظہ فرمائیے:

دو قیدی (نان پز اور ساقی) اپنا اپنا خواب بیان کر کے جناب یوسفؑ سے تعبیر پوچھتے ہیں۔ تعبیر کا آپ کو علم ہے لیکن جناب یوسفؑ موقع غنیمت جان کر فوراً موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنا پیغمبرانہ مشن ان دونوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میں تمہارا کھانا آنے سے پیشتر ہی اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم و صلاحیت مجھے میرے رب نے بخشی ہے۔ میں ان لوگوں کا طریقہ ترک کر چکا ہوں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔ میں نے تو اپنے آباؤ اجداد ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ کی ملت اختیار کر لی ہے۔ ہمارے لیے یہ زیبا ہی نہیں کہ ہم کسی شے کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ پیغام ایک فضل ہے ہم پر بھی اور تمام انسانوں پر بھی۔ لیکن اکثر لوگ اس کا شکر نہیں ادا کرتے۔ اے میرے قید کے ساتھیو! بہت سے متفرق ارباب بہتر ہیں یا خدائے واحد و قہار؟ تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف ایسے اسما کی بندگی کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں اور اللہ نے اس کی کوئی سند یا منظوری نہیں نازل فرمائی ہے۔ حکم (یا حکومت یا فیصلہ) تو بس اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس نے تو یہ امر کیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بھی بندگی نہ کرو۔ یہ ہے دین قیم لیکن اکثر لوگ اس سے لاعلم ہیں۔"

یہ پیغام حق دینے کے بعد تب حضرت یوسفؑ خوابوں کی تعبیر بتاتے ہیں۔ قرآن پاک نے ایک پیغمبر کی اصلی فطرت کی کتنی صحیح ترجمانی کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر ایک منٹ بھی اپنے مشن سے غافل نہیں ہوتا۔ اس کے سینے میں توحید کی جو آگ سی سلگتی رہتی ہے وہ اندر سے ہر آن پھیلنے کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔

پھر دیکھیے ساقی سے آپ فرماتے ہیں جب تم اپنے خود ساختہ رب (ملک مصر) کے پاس ہونا تو میرے حال کا بھی ذکر کر دینا مگر اس احسان فراموشی کو دیکھیے کہ دربار شاہی میں پہنچ کر اپنی شاہ پرستی میں گم ہو گیا۔ قرآن پاک اس قسم کے شاہی خدام کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے کہ "فانسہ الشیطن ذکر ربہ فلبث فی السجن بضع سنین" شیطان نے "ذکر رب" سے ہی اسے غافل کر دیا اور جناب یوسفؑ چند سال اور جیل میں پڑے رہے۔

آگے دیکھیے۔ ملک مصر نے ایک خواب دیکھا۔ لوگوں سے تعبیر دریافت کی۔ سب اسے خواب پریشان کہہ کر ٹال گئے۔ اب اس ساقی کو یوسفؑ یاد آئے اور اس نے کہا کہ "انا انبئکم بتاویلہ فارسلون" "ذرا

مجھے چھٹی دیجیے، میں ابھی آپ کو اس خواب کی تعبیر سے مطلع کرتا ہوں۔ ساقی قید خانے میں آکر کہتا ہے کہ "یوسف ایہا الصدیق افتنا" الخ یوسف! اے یار! ذرا اس خواب کی تعبیر تو بتانا ..... جناب یوسفؑ فرماتے ہیں کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ سات سال تو شاداب رہیں گے اور سات سال قحط رہے گا۔ لہٰذا ضرورت بھر غلہ استعمال کر کے باقی کو ذخیرہ کر لو۔

ایک عام انسان اور پیغمبر کی نفسیاتی فطرتوں کا فرق دیکھیے۔ ایک طرف تو خوشامدی اور خودغرض شاہی ملازم یعنی ساقی ہے اور دوسری طرف یوسفِ صدیقؑ۔ دونوں کے کردار و گفتار کا اندازہ کیجیے جس کا نقشہ قرآن نے کھینچا ہے۔ ساقی یہ تو کہتا ہے کہ میں تعبیر کی خبر لاتا ہوں لیکن وہ بدبخت اس عظیم المرتبت انسان کا نام نہیں بتاتا جس سے تعبیر دریافت کرنے جا رہا ہے۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ اس کی صحیح تعبیر یوسف ہی بتا سکتے ہیں لیکن وہ نام اس لیے نہیں بتاتا کہ اس کا کریڈٹ اور فائدہ خود اٹھانا چاہتا ہے۔ اصل محسن کو پیچھے رکھنا ہے اور اس کے احسان سے خود اپنا مقام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ پھر ایک اور خباثت دیکھیے۔ جنابِ یوسفؑ سے وہ اس خواب کا تذکرہ کس انداز سے کرتا ہے۔ یہ نہیں بتاتا کہ ملک مصر نے یہ خواب دیکھا ہے۔ ایسا نظر آ رہا ہے جیسے اسے یہ ڈر ہے کہ اگر یوسفؑ کو یہ معلوم ہو گیا د کہ یہ خواب ملک مصر نے دیکھا ہے، تو کہیں یوسفؑ خود ہی نہ کوئی فائدہ اٹھا لیں۔ اس لیے صرف خواب کا ذکر کرتا ہے، دیکھنے والے ملک کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ ذرا غور کیجیے اس اندازِ بیان پر۔ کیا خودغرض شاہی ملازمین کی نفسیات اور خبیث فطرت بالکل یہی نہیں جو قرآن نے پیش کی ہے؟

پھر دوسری طرف پیغمبرانہ ظرف کو بھی دیکھیے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو یہ کہتا کہ .... اب آئے ہو جب اپنی غرض ہوئی ہے؟ اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ میرا ذکر بھی کرنا۔ وہ تم نے کیا یا نہیں؟ جاؤ پہلے میرا تعارف کراؤ۔ میرا سلام کہو اور کہو کہ وہ قید و بند کی سختیوں میں مبتلا ہے پہلے اسے رہائی دلاؤ پھر تعبیر بتائی جائے گی ——— دوسرا کوئی معبّر ہوتا تو پہلے یہ پوچھتا کہ یہ خواب کس نے دیکھا ہے؟ پھر یہ معلوم ہوتا کہ ملکِ مصر نے دیکھا ہے تو ہزار حیلوں بہانوں سے اس تک پہنچنے

کی کوشش کرتا اور اپنی رہائی کی تدبیریں کرتا لیکن یہ کوئی معمولی انسان نہ تھا۔ ایک عالی ظرف، خوددار، فراخدل اور صابر و شاکر پیغمبر تھا اور اس کی فطرت نے ان تمام خوشامدانہ، منتقمانہ اور بے صبرانہ طریقوں کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ ساقی نے تعبیر پوچھی اور یوسفؑ نے بلا تامل تعبیر بتا دی۔ اور فقط تعبیر ہی نہیں بتائی بلکہ اس کی زد سے بچنے کی تدبیر بھی بتا دی کہ اس ہونے والے قحط سے اس طرح بچ سکتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اس سچی تعبیر پر ملک مصر کو حیرت ہوئی ہوگی کہ جسے سب خوابِ پریشاں کہہ رہے ہیں اسے ساقی ایک پیش آنے والی سچی حقیقت کا حامل بتا رہا ہے اور ساتھ ہی اس تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی پیش کر رہا ہے۔ یقیناً یہ اس ساقی کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی بات نہیں بلکہ کسی اور نے بتائی ہے۔ آخر پتہ چل ہی گیا ہوگا کہ پسِ پردہ یوسفؑ کی زبان بول رہی ہے۔ اسے یوسفؑ سے ملنے کی بے چینی پیدا ہوئی اور انھیں بلوا بھیجا۔ یوسفِ صدیقؑ کے ظرف کا اندازہ فرمایئے۔ ایسے موقعے پر دوسرا انسان جو سالہا سال سے قید خانے کی سختیاں جھیل رہا ہے کیا کرتا؟ یقیناً وہ اسے غنیمت سمجھتا اور شاہی دعوت پر فوراً لبیک کہتا بلکہ ملکِ مصر کے بلانے کو اپنے لیے باعثِ صد افتخار سمجھتا۔ لیکن یہ پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر تھا یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ۔ ملک مصر کے دعوت نامے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا بلکہ یوں للکار کر اپنی پیغمبرانہ خود داری کا اظہار کرتا ہے کہ:

"ارجع الی ربک فسئلہ مابال النسوۃ التی قطعن ایدیھن ..... الخ" واپس جاؤ اپنے آقا کے پاس۔ پہلے اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا اصل معاملہ کیا تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ میں ملک کے رحم و کرم کے صدقے میں رہائی نہیں چاہتا۔ اپنی استعداد و لیاقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی آزادی کا طلبگار نہیں۔ پہلے یہ فیصلہ کرو کہ میں مجرم ہوں یا بے گناہ، اور کیوں میں قید میں ڈال دیا گیا ہوں؟ —— آپ نے ہزاروں قیدی دیکھے ہیں۔ آپ نے یہ بھی ان کی زبان سے سنا ہوگا کہ ہمیں بغیر مقدمہ چلائے کیوں جیل میں بھیج دیا گیا؟ لیکن کیا آج تک آپ نے یہ

بھی دیکھا یا سنا ہے کہ قیدِ زنداں سے آزاد ہونے سے کسی نے انکار کر دیا ہو اور یہ کہا ہو کہ پہلے میرے جرم کی تحقیق کرو پھر میں آزاد ہوں گا؟ قرآنِ پاک کے اندازِ بیان کو دیکھیے۔ پیغمبرانہ فطرت کو کتنی خوبی سے واشگاف کیا ہے۔ مختلف انسانی فطرتوں کا رازداں بجز اس "فاطر" و خالق کے اور کون ہو سکتا ہے جو خود اپنے کلام میں ان فطرتوں کو ظاہر کرتا ہو؟

سورۂ یوسف میں ایک مقام کو دیکھیے۔ برادرانِ یوسف نے دھوکے سے یوسفؑ کو اندھے کنوئیں میں گرایا اور پھر ایک قافلے کے ہاتھ فروخت بھی کیا۔ جناب یعقوبؑ نے پہلے ہی ان کے مکر کو بھانپ کر فرما دیا تھا کہ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری غفلت سے اسے بھیڑیا نہ کھا جائے۔" فرزندوں نے یہی بہانہ بنایا اور اس جھوٹ کو جناب یعقوب تاڑ گئے اور فرمایا کہ "بل سولت لکم انفسکم امرا" تمہارے دلوں نے ایک بات بنالی ہے۔ جناب یعقوبؑ کی اس درّاکی کو برادرانِ یوسف دیکھ چکے تھے اور اس کے بعد بھی کئی موقعوں پر بصیرتِ یعقوبی کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن جب آپ فرماتے ہیں کہ "انی لاجد ریح یوسف لولا ان تفندون" تم مجھے سٹھیایا ہوا نہ سمجھو تو میں ایک بات کہوں۔ مجھے پیراہنِ یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔ اس کا جواب وہ کیا دیتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ "انک لفی ضلالک القدیم"۔ آپ تو وہ پہلے کی سی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ جن کا کردار یہ ہو کہ اپنے بھائی کو اندھے کنوئیں میں گرا دیں ان کی گفتار بھی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔ قرآن پاک نے عین ان کی فطرت ہی کی ترجمانی کی ہے۔

لیکن یوسفؑ کے کردار و گفتار کو بھی دیکھیے۔ تمام حقائق کھلنے کے بعد جب یہ خطاکار اعترافِ جرم کرتے ہیں تو برسوں کا یہ ستایا ہوا مظلوم بھائی انتقام کی تمام قدرتیں رکھنے کے باوجود یوں کہتا ہے کہ "لا تثریب علیکم الیوم ط یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین"۔ آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے اور وہ تو ارحم الراحمین ہے ——— کیا یہ گفتگوئیں دونوں کی عین فطرت کے مطابق نہیں؟ وہ کتاب جو دینِ فطرت کی تعلیم دینے آئی ہو، نقل کلام بھی متکلم کی فطرت ہی کے مطابق کرتی ہے۔

قصص میں فطرت کی صحیح ترجمانی کی یہ ایک مثال ہے۔ ایک دوسری مثال اور بھی دیکھیے

جہاں غلام قوم اور آزاد قوم کی فطرتوں کا فرق ظاہر کیا ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک چھوڑ دو دو پیغمبر (موسیٰ و ہارون) موجود ہیں جو انھیں فرعون کی غلامی سے نکال کر لائے ہیں۔ بنی اسرائیل ایک طرف تعلیم موسوی کو دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف بیسیوں محیر العقول معجزات کو۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ان کے ایمان، کردار اور گفتار کے نمونے ملاحظہ فرمایئے:

"موسیٰ! ہم تو من و سلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے۔ کچھ ساگ پات بھی تو اگواؤ۔"

"موسیٰ! ہم تو جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں تمہاری بات نہیں مانیں گے۔"

"موسیٰ! ہمیں تو تم ویسا ہی خدا بنا دو جیسا اُن (بت پرستوں) کے پاس ہے۔"

"موسیٰ! تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر (حماقت سے) جنگ کرو۔ ہم تو یہیں سے بیٹھے تماشا دیکھیں گے۔"

"موسیٰ! ہم بقرہ تو ذبح کریں لیکن وہ کیسا ہو؟ ..... اس کا رنگ کیا ہو؟ ..... اس کی کیا خاص صفت ہو؟"

"ارے موسیٰ تو بھول گئے ہیں۔ ہمارا اور موسیٰ کا اصل خدا تو یہ گوسالہ ہے جو سامری نے بنایا ہے۔"

"موسیٰ! ہم تو تمہارے آنے سے پہلے بھی مصیبت میں گرفتار تھے اور تمہارے آنے کے بعد بھی مصائب میں پھنسے ہیں۔"

آپ نے بنی اسرائیل کے کردار و گفتار کا نمونہ ملاحظہ فرمایا؟ یہ چند نمونے ہیں جو قرآن پاک سے پیش کیے گئے ہیں۔

اب ایک دوسرا منظر بھی دیکھیے۔ فرعون اپنے تمام آرائش و نمائش اور جاہ و جلال کے ساتھ دربار سجائے ہوئے ہے ساحرین اس امید پر اپنے ہتھکنڈوں سے تیار ہیں کہ موسیٰ پر غالب آجائیں اور شاہی انعامات حاصل کریں۔ ان ساحرین نے ان سے پہلے کبھی موسیٰ کو اور آپ کی کرامات

کو نہیں دیکھا ہے۔ ساری عمر خدا پرستی سے نا آشنا اور فرعون پرستی کے خوگیر رہے ہیں۔ مقابلہ ہوتا ہے تو فوراً یقین ہو جاتا ہے کہ موسیٰ جادوگر نہیں بلکہ خدا کا پیغمبر ہے۔ اس یقین کے پیدا ہوتے ہی سر بسجود ہو کر پکار اٹھتے ہیں کہ "آمنا برب العلمین ہ رب موسیٰ وھرون ہ" ہم موسیٰ و ہارون کے بتلائے ہوئے رب العلمین پر ایمان لے آئے۔ فرعون یہ کب برداشت کر سکتا تھا کہ جنھیں موسیٰ پر غالب آنے کے لیے بلایا گیا ہو وہی موسیٰ کے مرید بن جائیں اور ہماری خدائی کو خطرے میں ڈال دیں؟ فوراً اپنی سیاست اور اپنے جاہ و جلال کو حرکت میں لایا اور کڑک کر بولا:

"اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم ؟ ان ہذا لمکر مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منہا اہلہا ج فسوف تعلمون ہ"

تم میری منظوری (sanction) کے بغیر ہی موسیٰ پر ایمان لے آئے۔ یہ تم سب کی سازش ہے کہ بظاہر مقابلہ اور آخر میں شکست مان کر موسیٰ کا تفوق قائم کر دیا جائے تاکہ اس شہر کے باشندوں کو نکال باہر کرو۔ اچھا تو تمھیں عن قریب معلوم ہو جائے گا۔

"فلاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولا صلبنکم فی جذوع النخل"۔

تمھارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹوا دوں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دلوا دوں گا

ساحرین یہ جواب دیتے ہیں:

"لن نؤثرک علیٰ ما جاءنا من البینٰت والذی فطرنا"

فطرت بخشنے والے خالق اور موسیٰ کے لائے ہوئے فطری بینات پر ہم تجھ کو ترجیح دینے سے رہے۔

"فاقض ما انت قاض ط انما تقضی ہذہ الحیوٰۃ الدنیا"

کر لے جو کچھ کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس ذلیل زندگی ہی پر تیرا فیصلہ نافذ ہو سکتا ہے۔

"ربنا افرغ علینا صبرا وتوفنا مسلمین"

مولا! ہمیں صبر واستقامت سے بھرپور کردے اور ہماری موت اسلام پر ہو۔

فرعون کی دھمکیاں اور ساحرین کے جواب کئی جگہ قرآن پاک میں درج ہیں۔ ہم نے صرف چند نقل کیے ہیں۔ آپ نے اندازہ فرمایا ان ساحروں کے کردار و گفتار کا۔ کہاں تو موسیٰؑ کا مقابلہ تھا اور انعام شاہی کی آس اور کہاں یہ ایمان کی پختگی کہ فرعون کی ہزار شاہانہ دھمکیوں کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ آپ نے اوپر بنی اسرائیل کے کردار و گفتار کے نمونے بھی دیکھے اور ان قبطی ساحروں کے کیرکٹر کو بھی ملاحظہ کیا۔ دونوں میں کوئی نسبت ہے؟ آخر یہ اتنا عظیم انسان فرق دونوں میں کیوں ہے؟ بنی اسرائیل کی فطرت کو صدیوں کی غلامی نے مسخ کر دیا تھا اور غلامی و ایمان یا غلامی و کردار ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی ان کا جو انداز رہا ہے اسی کے نمونے ہیں وہ جو آپ نے اوپر ملاحظہ فرمائے بخلاف اس کے یہ ساحرین آزاد قوم کے افراد تھے اور کردار کی بلندی آزاد ہی قوموں میں ہو سکتی ہے۔ جب کافر تھے تو پکے کافر تھے۔ مومن ہوئے تو ایمان بھی ویسا ہی پختہ ثابت ہوا۔ یہ ہے آزاد اور محکوم کی ذہنیتوں کا فطری فرق جو کلام فطرت نے واضح کیا ہے۔

غرض قصص میں بھی ہر بات عین فطرت کے مطابق بیان کی گئی ہے کیونکہ قرآن فطرت کی زبان، فطرت کا صحیفہ اور نظامِ فطرت کا داعی ہے۔

اخلاق اور فطرت

ہم پچھلے صفحوں میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ انسان کی فطرتِ سلیمہ اخلاقی قدروں کا تقاضا کرتی ہے اور ان قدروں سے غرض یہی ہے کہ یہ فطرتِ سقیمہ پر غالب آجائیں۔ اسلام نے جن اخلاقی قدروں کو قائم کیا ہے ان کے متعلق بُری رائے قائم کرنے والا کوئی انسان نہیں پیدا ہوا اور اب دنیا کا ذہنی ارتقا ایسی منزل پر ہے کہ ہر عقلِ سلیم اور وجدانِ صحیح

رکھنے والا انسان فطرۃً ان کو تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کی تشریح کرنے اور نظائر پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہمدردی کرنی چاہیے سچ بولنا چاہیے۔ ناپ تول میں ایمانداری سے کام لینا چاہیے۔ ظلم نہیں کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ ہمیں یہ بتانے کی بھی کوئی خاص حاجت نہیں کہ اسلام نے فلاں فلاں اخلاقی قدروں کو قائم رکھنے پر زور دیا ہے۔ انسانی فطرت ان باتوں میں سے انکار کی جرأت نہیں رکھتی۔ لیکن اس مضمون کو چھیڑنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس باب کے چند پہلو ایسے ہیں جو اسلامی اقدارِ اخلاق کو دوسروں کی قائم کردہ اخلاقی قدروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مستحقِ توجہ چیز یہ ہے کہ اسلام کے پیشِ نظر صرف ایک فرد یا ایک مخصوص ملک یا قوم کی بھلائی نہیں۔ اس نے انفرادی تزکیے پر بھی زور دیا ہے لیکن مقصود اجتماعی تزکیہ ہے۔ اسلام کے پیشِ نظر پورا اجتماع ہے اور اجتماع سے مقصد مخصوص قومی اجتماعیت نہیں بلکہ پوری انسانی برادری ہے۔ اس لیے اس نے کسی ایسی قدر کو قابلِ قدر تسلیم نہیں کیا جو انفرادی حیثیت سے تو مفید نظر آئے مگر انسانی سوسائٹی کے لیے مضر ہو۔ بخلاف اس کے وہ اس قدر کو روا رکھتا ہے جو انفرادی حیثیت میں خواہ مضر ہو جائے لیکن عام انسانوں کے لیے مفید ہو۔

ایک امریکن بڑا سچا ہو سکتا ہے لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ اس سے اس کا یا اس کی قوم کا فائدہ ہو یا کم از کم نقصان نہ ہو۔ اگر کسی وقت جھوٹ ہی میں اس کی قوم کا فائدہ ہو تو وہ جھوٹ ہی کو عین اخلاق سمجھے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانے کے لیے بھی جھوٹ کو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی اپنی قوم کا اس سے فائدہ ہو ——— لیکن اسلام اس "قومی جھوٹ" کا روادار نہیں۔ وہ سچائی کو برقرار رکھتے وقت پوری انسانی برادری کو پیشِ نظر رکھتا ہے نہ کہ کسی ایک فرد یا ملک یا قوم کو۔ لہٰذا اگر کسی شکل میں پوری انسانی برادری کا فائدہ جھوٹ میں ممکن ہو تو شاید وہ اس کی اجازت دیدیتا لیکن چونکہ ایسا کوئی جھوٹ موجود نہیں

اس لیے اس نے کسی ایسے جھوٹ کو روا نہیں رکھا جس میں کسی ایک قوم کا تو فائدہ ہو اور دوسرے کا نقصان۔ اگر حالتِ اضطرار پیدا ہو جائے یعنی بغیر غلط گوئی کیے کسی کی جان نہ بچ سکتی ہو تو انفرادی حیثیت اسے صرف اجازت دے کہ حکم، ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا اثر دوسروں کے نقصان تک ممتد یا متعدی نہیں ہوتا۔

اب دوسری طرف بھی دیکھیے۔ اسلام چوری کا روادار نہیں۔ لیکن بعض صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جہاں چوری کو چوری میں شمار ہی نہ کیا جائے۔ فرض کیجیے ایک شخص کسی کو قتل کرنے کی نیت سے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ زید کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کسی بے گناہ (یا معمولی مجرم) کو قتل کرنے کی نیت سے جا رہا ہے۔ اس کو اتنا موقع بھی نہیں کہ وہ اس بے گناہ کو اطلاع کر سکے تاکہ وہ اپنی حفاظت کا سامان کر لے۔ اس تنگ وقت میں زید اس قاتل کی بندوق یا پستول چرا کر غائب کر دیتا ہے اور اس طرح ایک بے گناہ کو قتل سے بچا لیتا ہے۔ ایک جوگی یا سادھو یا زاہد متقشف تو اسے چوری ہی کہے گا اور اگر زید کی بجائے وہ خود ہو تو شاید کبھی اس چوری کی ہمت نہ کرے لیکن اسلام کی نگاہوں میں وہ چوری چوری نہیں ہوگی اور فطرتِ عقل کا بھی یہی فتویٰ ہوگا اس لیے کہ اس میں تنہا ایک ذات کا سوال نہیں۔ "من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً"۔ "جو شخص کسی انسان کو بداشِ قتل یا فساد فی الارض کے بغیر قتل کرتا ہے وہ گویا تمام انسانوں کی جان لیتا ہے (کیونکہ اپنی فطرت میں ہر انسان آدم ہے) اور جو اس کی جان بچاتا ہے وہ گویا تمام انسانوں کی جان بچاتا ہے۔ گویا وہ "چور" بندوق یا پستول کو چرا کر صرف ایک کی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی جان بچاتا ہے اور اگر وہ مارا جاتا تو گویا یہ سارے انسانوں کی ہلاکت ہوتی۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں جو اصل روح کارفرما ہے اس کی حیثیت محض پابندیِ قانون کی نہیں بلکہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر روح ہے جو پوری زندگی میں جاری و ساری ہوتی ہے اور زندگی کے جتنے شعبے ہیں ان سب کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس کا کام صرف

یہ ہوتا ہے کہ ہر قدم پر فطرتِ سقیمہ پر فطرتِ سلیمہ کو غالب کر دے۔

پھر ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ عام اور نارمل حالات میں تو انسان اخلاقی قدروں کی نگہداشت آسانی سے کر لیتا ہے۔ یہ اخلاق کی معمولی سطح ہے اور دنیا میں اس فطرت کے لوگوں کی کمی نہیں جو نارمل حالات میں اخلاقی قدروں کی حفاظت کر لیتے ہیں۔ لیکن ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں ان اقدار کا امتحان ہوتا ہے۔ اور ایک طرف انسان اپنے فطری رجحان کی شدت سے مجبور ہو جاتا ہے اور دوسری جانب اخلاقی اقدار اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایسے نازک مواقع پر انسان ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ معاملہ ذات کی حد تک محدود ہو اور شخصی ہو اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں سے متعلق ہو۔

فرض کیجیے ایک شخص نہایت عالی کردار ہے لیکن ایک بالکل خلافِ اخلاق بات پر اسے مجبور کیا جاتا اور اس کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ اب دیکھیے جان بچانے کا جذبہ فطری جذبہ ہے اور اخلاقی قدریں استقامت علی الحق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایسے موقعے پر اسلام انسانی فطرت کے رجحان کا لحاظ رکھتا ہے اور ہر فطرت کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اگر وہ کمزور ہے اور فطرت جان کو ترجیح دیتا ہے تو اس کے لیے یہی اجازت ہے کہ اپنی جان بچا لے اور اگر اس کی فطرت مضبوط ہے تو جان کی پروا نہ کرے۔ مسلمان ہے اور کفر بکنے کے لیے گلا گھونٹا جا رہا ہے یا بھوک سے جان جا رہی ہے اور طعامِ حرام کے سوا کوئی شے میسر نہیں۔ ایسی حالتوں میں اپنے اپنے ضمیر کی آواز پر یا استطاعت کی حدود پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اسے بقدرِ حاجت اور عدمِ رغبت پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اس وقت بھی ایک چیز ضرور پیشِ نظر رکھنی ہوگی اور وہ یہ کہ اعلیٰ مقصد کے لیے اس کا جینا زیادہ مفید ہے یا مرنا۔ جو زیادہ مفید ہو اسی پر عمل کرنا چاہیے۔

ان دونوں مثالوں کے لیے قرآنی سند یوں ہے:

(۱) من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا

فعلیہم غضب من اللہ ولہم عذاب عظیم (۱۶: ۱۰۶) یعنی جو شخص اپنے ایمان کے بعد کفر کرتا ہے وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن و قائم ہو، بلکہ جس نے اپنا سینہ کفر کے لیے کھول دیا ہو تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب نازل ہوگا اور ان کے لیے بڑی سزا بھی ہے۔

(۲) انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اہل لغیر اللہ بہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان اللہ غفور رحیم (۱۶: ۱۱۶) یعنی اللہ نے تم پر مردار، خون، لحم خنزیر اور ما اہل بہ لغیر اللہ (یعنی جس کے متعلق واضح ہو کہ غیر اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہے) حرام کیے ہیں۔ پھر جو شخص حالت اضطرار میں ہو مگر رغبت قلبی نہ رکھتا ہو اور حد ضرورت سے بھی نہ گزرے تو اللہ غفور رحیم ہے۔

یہ مثالیں ایسی ہیں جن کا تعلق ذاتی معاملے سے ہے۔ اس کے بعد دوسرا اسٹیج ایسا ہے جو اس سے بھی زیادہ نازک ہے اور وہاں مجبورانہ انداز نہیں ہوتا بلکہ قاہرانہ شان ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر قوت و طاقت کی بدمستیاں سوار ہوتی ہیں اور پچھلی مظلومیت کی یاد جذبۂ انتقام کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کر رہی ہوتی ہے۔ انتقام فطرت کا جذبہ ہے لیکن یہ فطرت سقیمہ ہے جس پر فطرت سلیمہ کو غالب کر دینا منشا ہے قانون اخلاق کا۔ اس کے لیے ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ہو اقرب للتقوی

کسی قوم کی قومی عداوت تمہیں ترک عدل پر نہ ابھارے۔ عدل تو بہر حال کرنا ہی ہوگا۔ تقویٰ سے یہی قریب تر ہے۔

دیکھیے بڑے سے بڑے کردار والا انسان بھی جو ذاتی معاملات میں کتنا ہی بلند ہو، قومی معاملات میں آکر پھسل جاتا ہے۔ اسی مقام پر پتہ چلتا ہے کہ اس کے نظریات و تصورات خالص انسانی اور ہمہ گیر ہیں یا ایک خاص حلقے میں محدود اور بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر انسانی ہیں تو وہ کلی خیر ہیں اور ہمہ تن فطرت سلیمہ ہیں اور اسی فطرت کو اسلام دوسری تنگ فطرتوں پر غالب رکھنا چاہتا ہے۔